

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## اشارات

شوال کی اشاعت میں اعلان کیا گیا تھا کہ وسط ذی القعدہ ۵۶ھ میں دفتر ترجمان القرآن حیدرآباد

دارالسلام منتقل ہو جائیگا۔ لیکن اُس وقت اُن مشکلات کا اندازہ نہ تھا جو بعد میں پیش آنے والی تھیں۔

اگرچہ اعلان کے مطابق ذی القعدہ ہی میں دفتر منتقل کر دیا گیا، اور ذی القعدہ کا پرچہ بھی دارالسلام شائع ہوا، مگر حسب

دفتر کو حیدرآباد کی سرزمین پڑ کر بیٹھی گئی اور احرار محرم تک اس کو نہ چھوڑا۔ جن لوگوں کو ترکِ وطن کی مصیبت کبھی سابقہ

ہو، وہ خود ہی اُن مشکلات کا اندازہ کر سکتے ہیں جو مجھے پیش آئی ہوں گی۔ دس سال تک جو شخص ایک جگہ رہا ہو، اور

من کل الوجوه اس کو وطن بنا چکا ہو اس کے لیے لیک ایک اپنا گھر بار اٹھا کر ڈیڑھ ہزار میل دور لے جانا بہر حال کچھ نہ

کچھ پریشانیوں کا موجب ہونا چاہیے۔ چنانچہ یہ پریشانیاں پیش آئیں اور انہی کی وجہ سے ذی الحجہ اور محرم کے پرچے

شائع نہ ہو سکے۔

رسالہ کے ناظرین کو پہلے ہی سے پرچہ کے بروقت شائع نہ ہونے کی شکایت تھی اب اتنے طویل التوا

نے ان کو بالکل بے لہجہ کر دیا اور دفتر میں شکایات کے انبار لگ گئے۔ میں درحقیقت اس بات پر بہت شرمندہ

ہوں کہ خریداروں کو بار بار شکایت کا موقع ملتا ہے لیکن اگر اس رسالہ کے ناظرین میں یہ احساس پیدا ہو چکا ہے کہ

وہ محض رسالہ کے خریدار نہیں ہیں بلکہ سیر رفیقِ کار ہیں تو انکارِ فوقِ ان سے توقع رکھتا ہے کہ وہ اسکی شکایات سے زیادہ ہمدردی کا سامنے لیں گے۔

اگر کوئی غیر متوقع صورت نہ پیش آئی تو انشاء اللہ ذی الحجہ، محرم، اور صفر کے پرچے پے در پے

شائع کر کے، ربیع الاول سے رسالہ کی اشاعت ٹھیک وقت پر ہونے لگے گی، و ما توفیقی الا باللہ

ماہ فروری کے معارف میں جناب لانا سید سلیمان ندوی نے ترجمان القرآن اور اسکے ایڈیٹر، اور

دارالاسلام کی تجویز کا جس بھروسہ اور پُر خلوص انداز کے ساتھ ذکر فرمایا ہے، اسکے لیے میں ان کا دل سے

شکر گزار ہوں۔ اپنی کوتاہیوں اور کمزوریوں کو جاننے کے باوجود میں نے اب جن ذمہ داریوں کا بار اٹھانے

کی ہمت کی ہے، ان کو سنبھالنے اور ان سبکدوش ہونے کے لیے میں ہندوستان کے معدود چندن

بزرگوں کی اخلاقی اعانت پر اعتماد رکھتا ہوں اور ان میں سے ایک مولانا بھی ہیں۔ اپنی قدیم نیاز مندگی کی پتلا

پر میں انکی عنایات و توجہات کا صرف متوقع ہی نہیں ہوں، بلکہ شاید حقدار بھی ہوں۔

اسی سلسلہ میں لانے دو چیزوں کی شکایت بھی فرمائی ہے۔

پہلی شکایت کی بنیاد گذشتہ ماہ شعبان کے اشارات میں مولانا کی اُس تقریر سے ایک اقتباس کر

درج کیا گیا تھا جو انہوں نے مدراس میں ارشاد فرمائی تھی اور انصاری، الجمعیت، مدینہ اور بعض دوسرے اخبارات

میں شائع ہوئی تھی۔ میرے نزدیک وہ تقریر معاویہ اسلامی کے خلاف تھی اس لیے میں نے اپنا فرض ادا کر کے

خاطر اس پر تنقید کی۔ مولانا کو اس پر یہ شبہ ہوا کہ شاید میں بھی ان لوگوں میں شامل ہو گیا ہوں جن کی

پروپیگنڈا ایک فن (فن ہی نہیں پیشہ) کی حیثیت اختیار کر چکا ہے، اور یہ کہ میں نے قصداً اٹلی ذرا

گرامی پر حرف لانے کے لیے ان کے ارشادات کی ”تردید میں ان موٹنگانیوں اور نازک استنباطوں

کا کام لیا ہے جو کہنے والے (یعنی خود مولانا) کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں۔“

اگر اسکے ساتھ ہی مولانا تھوڑی سی مزید تکلیف گوارا فرما کر یہ بھی لکھ دیتے تو بہتر ہوتا کہ جو فقرے

میں اپنے مضمون میں نقل کیے ہیں، آیا وہ انہی کے ہیں یا غلط طور پر انکی طرف منسوب کیے گئے ہیں، اور اگر وہ

اپنی کے ہیں تو ان کا صحیح مطلب کیا ہے۔ اس صورت میں مجھے اپنی غلطی معلوم ہو جاتی، اور میں کھلے دل کے ساتھ انکی خدمت میں معافی کی درخواست پیش کرتا۔ لیکن بحالت موجودہ میں یہ کہنے پر پھر مجبور ہوں کہ مولانا نے اپنی مدراس کی تقریر میں (جبکی شائع شدہ۔ پورٹ کے صحیح ہونے سے اب بھی انہوں نے انکار نہیں فرمایا ہے) جو کچھ فرمایا تھا وہ نامناسب تھا، اور امت مسلمہ کے ایک ذمہ دار فرد ہونے کی حیثیت سے جو فرائض مولانا پر عائد ہوتے ہیں انکے لحاظ سے وہ اور بھی زیادہ قابل اعتراض تھا۔

میں یہ سمجھنے سے بالکل معذور ہوں کہ اس نازک دور میں ہمارے ذمہ دار رہنماؤں، اور خصوصاً کانگریس کی طرف میلان رکھنے والے بزرگوں نے مسلمانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے تحریر کے بجائے تقریروں اور پرائیویٹ مہجنتوں کو کیوں پسند فرمایا ہے۔ اگر وہ واضح طور پر اپنے خیالات تحریر فرمائیں تو معلوم ہو سکتا ہے کہ انکے پاس کیا دلائل ہیں۔ اس صورت میں ایک مستند بیان کی بنیاد پر اچھی طرح بحث کی جاسکتی ہے، اور صحیح کو غیر صحیح سے منقح کر کے عام مسلمانوں کے سامنے ایک شاہراہ مستقیم پیش کی جاسکتی ہے۔ لیکن وہ تحریریں تو اپنے خیالات پیش نہیں کرتے اور منتشر طور پر جلسوں میں تقریریں کر دیتے ہیں پہلے تو خود سامعین کے خیالات میں ان تقریروں سے انتشار پیدا ہوتا ہے۔ پھر انکی غیر مستند پورٹیں اخبارات میں شائع ہوتی ہیں اور ان سے مزید انتشار رونما ہوتا ہے۔ جو لوگ ان سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں وہ انہیں مسلمانوں میں لیے پھرتے ہیں کہ دیکھو فلاں عالم دین اور فلاں بزرگ قوم بھی وہی کہتے ہیں جو ہم کہہ رہے ہیں۔ جو لوگ ان سے اختلاف رکھتے ہیں وہ محض اس خیال سے تنقید کی جرأت نہیں کر سکتے کہ کہیں رپورٹ غلط نہ ہو اور بعد میں تردید نہ ہو جائے۔ اس طرح یہ ناقابل اعتبار تقریریں تلک میں پھیلی رہتی ہیں اور فاضل خطیب غاموشی کے ساتھ ان کو دیکھتے رہتے ہیں۔ تردید اور توجیہ کی ضرورت ان کو صرف اس وقت محسوس ہوتی ہے جب اس قسم کی "ایک آدمی" نامی تقریر کے برے اثرات

کو دیکھ کر کوئی شخص مجبوراً اس پر تنقید کرتا ہے۔ یہ طریق کار جن بزرگوں نے اپنے لیے پسند کیا ہے، میرے نزدیک تو وہ غالباً اپنی ذمہ داریوں کے احساس سے غافل ہیں۔ انہوں نے شاید ابھی تک یہ محسوس ہی نہیں کیا ہے کہ مسلمان اس وقت کیسی خطرناک پر اگندہ خیالی میں مبتلا ہیں، اور اس حال میں ان کو واضح رہنمائی کی کس قدر سخت ضرورت ہے۔ کاش میری ہی تنقید کا یہ اثر ہوتا کہ مولانا اپنے خیالات تفصیل کے ساتھ بیان فرما دیتے۔ لیکن انہوں نے بس اتنا لکھ کر بحث ختم کر دی کہ ”مجھے ان کے (یعنی ایڈیٹر ترجمان القرآن کے) مقدمات اور اصل مقصد سے پورا اتفاق ہے، اختلاف ہے تو ان کی تحریر کے نتائج اور طریق کار سے۔“ میں نے اس فقرے سے روشنی حاصل کرنے کی بہت کوشش کی، مگر مجھے کچھ نہ معلوم ہو سکا کہ میری تحریر کے کن نتائج سے کیا اور کیوں اختلاف ہے اور میرا طریق کار اگر پسند نہیں، تو اس سے بہتر کیا طریق کار مولانا کے پیش نظر ہے، اور اس کو بیان کرنے کے لیے اور کس وقت کا انتظار ہے۔

مجھے یہ اعتراض صرف مولانا سید سلیمان ندوی ہی پر نہیں ہے، بلکہ صف اول کے اُن تمام علماء پر ہے جو اپنی عملی جدوجہد یا زبانی بہادر روحی مسلمانوں کو ہندوستانی قومیت اور ڈیموکریسی کے خطرناک جال کی طرف ہانکے لیے جا رہے ہیں، یا اس جال میں ان کو پھنستے ہوئے خاموشی کے ساتھ بیٹھے دیکھ رہے ہیں۔ ان میں ایک بزرگ نے بھی آج تک مسلمانوں کو یہ نہ بتایا کہ جس راستہ کی طرف وہ انہیں دعوت دے رہے ہیں، یا جس راستہ پر انکے جانے کو گوارا کر رہے ہیں، اسکے علاوہ مستقیم ہونے پر کیا دلائل انکے پاس ہیں۔ مولانا ابوالکلام جنکی سابقہ خدمات کے اعتماد پر بہت مسلمان آج آنکھیں بند کر کے انکے پیچھے چلے جا رہے ہیں، انکی ایک آدھ تحریر اور ایک آدھ نام تمام تقریر کے حوالے آج تک کوئی چیز سامنے نہیں آئی، اور لطف یہ ہے کہ جو چیز سامنے آئی ہے اس میں بھی بجز خطابت اور غسٹہ کے کسی معقول استدلال کا نام و نشان تک نہیں پایا جاتا۔ مولانا حسین احمد صاحب جنکے علم و فضل، تقویٰ و طہارت

ایشان وفودیت، اور مرکزی شخصیت کے اعتماد پر علماء کا ایک بڑا گروہ راہِ راست سے ہٹ گیا ہے، معتقدین اور  
مقددین کے سامنے تو بہت کچھ فرماتے ہیں، مگر ناقدین کے سامنے کوئی مستند اور مفصل بیان پیش کرنے کی  
آج تک انہوں نے تکلیف نہ فرمائی۔ ان کے بعض مکتوبات کبھی کبھی اخبارات میں شائع ہو جاتے ہیں، مگر  
ان کو پڑھ کر یہ شبہ اور زیادہ قوی ہو جاتا ہے کہ مولانا حالاتِ حاضرہ سے قطعاً بے خبر ہیں اور انہوں نے  
اب تک یہ سمجھا ہی نہیں کہ واقعات کی رفتار ہندوستان کو کدھر لے جا رہی ہے، اور مسلمانانِ ہند کے  
قومی مسئلے اب کیا نوعیت اختیار کر لی ہے۔ مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب جنکی ذمہ داری  
صدر جمعیت علمائے ہند سب سے بڑھ کر ہے، بالکل خاموش ہیں، اور جمعیت العلماء کے ارکان  
اپنے اپنے ذاتی رجحانات کی بنا پر جدھر منہ اٹھا رہے ہیں، گویا کہ جمعیت واقع میں ختم  
ہو چکی ہے، مگر اس کا نام باقی ہے اور اس نام سے ہر شخص کو حسبِ فائدہ اٹھانے اور مسلمانوں کی رائے پر  
ڈالنے کا اختیار حاصل ہے۔ جمعیت العلماء نے آج تک کانگریس کی غیر مشروط شرکت اور مسلم ماس گائیڈنگ  
کی حمایت کا فیصلہ نہیں کیا۔ مگر جمعیت کا اخبار اور جمعیت کے ممتاز ارکان اور اس کے ذمہ دار ارکان  
مسلمانوں کو اس مہلک راستے کی طرف کھینچنے لے جا رہے ہیں اور مسلمان سمجھ رہے ہیں کہ یہ جمعیت کی  
پالیسی ہے۔ یہ آخر کیا صورتِ حال ہے اور کب تک جاری رہے گی؟ ان بزرگوں کے مراتب عالیہ کا احترام  
مانع نہ ہوتا تو میں انکو چیلنج دیتا کہ اگر آپ کے پاس کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ یا بدرجہ آخر عقل ہی  
اس طرز عمل کیلئے کوئی دلیل ہے تو اسے سامنے کیوں نہیں لاتے تاکہ ہم بھی اسے دیکھیں اور حق تو  
اسکا اتباع کریں۔ اور اگر آپ کے پاس کوئی دلیل نہیں، اور محض اپنے نفس کے رجحانات ہیں تو آپ کو  
لے مولانا کی اس بے خبری کو دور کرنے کے لیے متعدد چیزیں انکی خدمت میں پیش کی گئیں تاکہ وہ ان کو پڑھ کر رائے  
تائیم فرمائیں۔ مگر ہمیشہ ہی معلوم ہوا کہ مولانا کو ان کے پڑھنے کی فرصت نہیں ملی۔ سوال یہ ہے کہ جب تک مولانا کو مطالعہ کیلئے  
فرصت نہیں ملتی تو قوم کی رہبری کے لیے کیوں فرصت مل جاتی ہے؟ حالاتِ زمانہ اور مسائلِ وقت سے بے خبر رہ کر  
قوم کی رہبری کرنا ایک امر عجیب ہے!

کیا حق ہے کہ اس قوم کو اپنے رجحاناتِ نفس کے اتباع کی دعوت دیں جو آپ پر عالمِ دین ہونے کی حیثیت سے بھروسہ کرتی ہے، نہ کہ عمرو زید ہونے کی حیثیت سے۔

میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جنہوں نے پروپیگنڈا، اور شخصی نزاعات اور سب و شتم کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے۔ بزرگانِ قوم کی بگڑیاں اچھالنے والوں، اور سیاسی اختلافات کو ذاتی عداوت میں تبدیل کرنے والوں کی روش سے میں ہمیشہ بیزار رہا اور آج بھی بیزار ہوں۔ جو لوگ مجھے جانتے ہیں وہ اس حقیقت کو بھی جانتے ہیں۔ میرے لیے اس سے بڑھ کر کوئی تکلیف دہ بات نہیں ہو سکتی کہ اپنی قوم کے جن اکابر کا انتہائی احترام میرے دل میں ہے، ان کے خلاف زبان کھولوں۔ اکابر قوم تو درکنار ایک عامی مسلمان کی عزت بھی میرے لیے نہایت بیش قیمت ہے۔ لیکن صرف دو چیزیں ہیں جو مجھ کو اس وقت زبان کھولنے پر مجبور کر رہی ہیں۔ ایک یہ کہ میرے نزدیک خدا کا دین اور اس کی امت مسلمہ کا مفاد دنیا کی ہر شے اور ہر تعلق سے زیادہ قیمتی ہے، اور جب میں دیکھتا ہوں کہ کوئی شخص دانستہ یا نادانستہ اس کو نقصان پہنچا رہا ہے تو میں اس کی مزاحمت کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں، خواہ وہ میرا قریب ترین عزیز ہو، دوست ہو، استاد ہو یا میری قوم کا کوئی بڑے سے بڑا آدمی ہو۔ اس معاملہ میں کسی تعلق یا کسی نیاز مندی کی پرواہ کرنے سے میں بالکل معذور ہوں۔ جس کسی کو میرے اس طرز عمل سے تکلیف ہو وہ اگر اپنا حق پر ہونا دلیل سے ثابت کر دے گا تو میں نہ صرف اپنی غلطی کا اعتراف کروں گا، بلکہ نہایت ادب سے معافی بھی چاہوں گا خواہ وہ دنیوی لحاظ سے حقیر ترین آدمی ہو۔ اور اگر وہ مجرد شکایت کرے گا تو میں صاف عرض کروں گا کہ حق کے معاملہ میں بڑے اور چھوٹے، اپنے اور پرانے کی تمیز سے مجھے معاف رکھا جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جس شخص کو میں کسی دینی یا قومی معاملہ میں غلطی کرتے ہوئے دیکھتا ہوں، خود اس کی عاقبت کا خیال مجھے مجبور کرتا ہے کہ دنیا ہی میں اس کو اصلاح کی طرف لانے کی کوشش کر لوں۔

میرے نزدیک ہر مسلمان کا اور خصوصاً مسلمانوں کے علماء اور اکابر کا میرے اوپر یہ حق ہے کہ ان کو ایسی غلطیوں سے بچانے کی کوشش کروں جنکے متعلق میں اپنی تحقیق کے مطابق یہ سمجھتا ہوں کہ خدا کے ہاں وہ ان پر ماخوذ ہونگے، اور یہی حق میرا بھی دوسروں پر ہے، اگر وہ اپنی ذمہ داری کو سمجھیں۔ لوگوں کو میری نیت پر شبہ کرنے کا اختیار ہے، مگر میرا ضمیر اپنی جگہ مطمئن ہے کہ میں جس سے اختلاف کرتا ہوں اسکی سچی خیر خواہی میرے دل میں ہوتی ہے، نہ کہ بدخواہی۔

اس وقت میں علی وجہ البعیرت یہ سمجھ رہا ہوں کہ جو لوگ ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کو انکی تالیخ کے اس نازک ترین دور میں اُس راستہ کی طرف لے جا رہے ہیں جس میں انکے جان و مال کا نہیں بلکہ ایمان اور اخلاق کا دیاں ہے، وہ اتنے بڑے گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں کہ شاید قیامت کے روز خدا کی میزان میں وہ اپنی عمر بھر کی عبادتوں اور اپنی تمام دینی خدمات کو اس ایک گناہ کی بددلت ضائع ہوتے دیکھ کر صک دک رہ جائینگے۔ ایسے سراسر انکی خیر خواہی کا جذبہ مجھے یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ حق اور باطل کے فیصلہ کو اُس روز کے لیے نہ چھوڑو جب تلافی کا وقت باقی نہ رہیگا۔ خدا کی کتاب، اسکے رسول کی سنت اور اسکی دی ہوئی عقل، باتینوں چیزیں احقاق حق و ابطال باطل کیلئے یہیں موجود ہیں۔ آؤ! ان کے ذریعہ تحقیق کر لیں کہ حق کیا ہے۔ اُس شخص کی طرح نہ بنو جنکے متعلق قرآن میں آیا ہے کہ **وَإِذْ آتَيْنَاهُ الْكِتَابَ أَنْ تَلْقَىٰ لَهُمُ الْقُرْآنَ مُحْضَرًا** کہ جب اس سے کہا جا کہ خدا تو جوڑی عزت کا خیال اس کو کپڑے اور وہ گناہ پر جا رہے۔ خطابت، سخن پروری، سفسطہ، منطقی اینچ پیچ، سب اس دنیا ہی میں چل سکتے ہیں۔ آخرت میں نہیں چل سکتے۔ بندوں کا منہ بند کر سکتے ہیں۔ خدا کا منہ بند نہیں کر سکتے۔ ہم تم سے وہ جواب نہیں چاہتے جو دنیا والوں کو دے کر چپ کیا جاتا ہے۔ ہم وہ جواب چاہتے ہیں جو تم نے خدا کی عدالت میں پیش کرنے کے لیے اٹھا رکھا ہے۔ شاید کہ یہیں اس کی

غلطی واضح کی جاسکے، اور تم خدا کی پکڑ سے بچ جاؤ۔

علماء کا مرتبہ یقیناً بڑا ہے، اور ان کا احترام ہر مسلمان پر واجب ہے، مگر ان کا مرتبہ جتنا بڑا ہے اتنی ہی بڑی انکی ذمہ داری بھی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو انبیائے بنی اسرائیل سے تشبیہ دی ہے، یعنی جس طرح بنی اسرائیل کے انبیاء اپنی قوم کی ہدایت کے ذمہ دار اور اس کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ تھے، اسی طرح خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد علمائے اسلام مسلمانوں کی ہدایت کے ذمہ دار ہیں، اور اگر انکی غفلت یا غلط رہنمائی سے مسلمانوں میں کوئی گمراہی پھیلے تو وہ خدا کے سامنے اسکے جوابتہ ہونگے۔ اسی بنا پر حضور نے اپنی امت کیلئے جن تین چیزوں کو سب سے زیادہ خطرناک بتایا ہے ان میں اولین چیز ذلۃ العالم (عالم کی لغزش) ہے کیونکہ عالم کی لغزش ایک پوری قوم کیلئے موجب ضلالت بن سکتی ہے۔ اسی بنا پر بزرگوں نے عالم کی لغزش کو کسریٰ سے تشبیہ دی ہے، کہ جس طرح کشتی کے ٹوٹنے سے اسکے تمام مسافر ڈوب جاتے ہیں، اسی طرح عالم کی غلط روی سے لاکھوں کروڑوں بندگان خدا تعالیٰ ضلالت میں جا گرتے ہیں۔ اور اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے علماء کی خصوصیت یہ بیان فرمائی ہے کہ ان میں خوفِ خدا ہونا چاہیے (وَمَا تَحْشَىٰ اللَّهُ مِنَ الْعِبَادِ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذُنُوبِ الْعِبَادِ) کیونکہ خدا کا خوف اور یوم الحساب کی باز پرس کا خطرہ ہی انسان کو ضلالت و مفلس بننے سے بچا سکتا ہے۔

پس ہندوستان کے جو علماء کرام خدا اور رسول کے ارشادات کو سند میں لا کر دعویٰ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی رہنمائی کا اصلی حق انہی کو پہنچتا ہے اور وہی اس قوم کے فطری لیڈر ہیں، انہیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ یہ حق نرا حق ہی نہیں ہے بلکہ اپنے ساتھ ذمہ داری کا بہت بڑا بوجھ لانا ہے۔ امتِ محمدیہ کے آٹھ کروڑ افراد کی رہنمائی کوئی کھیل نہیں ہے کہ اس کو انجام دینے میں



سہل انگاری برقی جائے جو برقی جا رہی ہے۔ یہ ایسا نازک کام ہے کہ اس میں ذرا سی لغزش ایک پوری قوم اور اس کی آئندہ نسلوں کیلئے تباہی اور گمراہی کا راستہ کھول سکتی ہے، اور اپنے مرتکبین کو خدا کے سامنے اس حال میں لجا کر کھڑا کر سکتی ہے کہ ان کے سر پر صرف اپنے ہی گناہوں کا بوجھ نہ ہو، بلکہ موجودہ اور آئندہ دور میں جو جو مسلمان انکے کھولے ہوئے راستے پر چل کر بڑھ ہو اس کے ہر ہر گناہ کا ایک حصہ انکے حساب میں بھی لکھ دیا گیا ہو، اور کروڑوں بندگانِ خدا انکے مقابلہ میں استغاثہ کر رہے ہوں کہ رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُنَّا لِمَعْنَاهُمْ قَاعًا فَاصْلُوْنَا لِيَسْتَلْزَمَ رَبَّنَا أَنزِلْ عَلَيْنَا مَائِدًا مِنَ السَّمَاءِ الَّتِي يُكَفِّرُ بِهَا الذُّنُوبَ وَأِنَّ رَبَّنَا لَغَفُورٌ - ایسے نازک کام کی ذمہ داریوں کا صحیح احساس جن رہنماؤں کے دل میں ہو، ان کے لیے تو راتوں کی نیند حرام ہو جانی چاہیے، ان کو تو ہر وقت تلاشِ حق میں بے چین رہنا چاہیے، ان کو تو اس خوف سے ہر وقت کا پختہ رہنا چاہیے کہ نادانستگی میں وہ امت کو کسی غلط راستے پر نہ چلا لے جائیں، ان کو تو مشکوک راستوں سے بھی بچنا چاہیے، کجا کہ کسی راستے کی غلطیاں کسی راستے کے نقصانات، کسی راستے کے خوفناک امکانات ان کے سامنے کھول کھول کر پیش کیے جائیں، ان کو بار بار متنبہ کیا جائے، انہیں سمجھنے یا سمجھا دینے کی پیہم دعوت دی جائے اور پھر بھی وہ کانوں میں تیل ڈالے بیٹھے رہیں، اور اپنی کرنی سے باز نہ آئیں۔ جب علماء کی یہ روش ہو تو پورا نہیں بھی شکایت نہ کرنی چاہیے اگر قوم کی دوسری روش ہو۔

کلام کی رو میں بات کہیں سے کہیں چلی گئی۔ مجھے ابھی مولانا کی ایک اور بزرگانہ شکایت کا جواب دینا ہے۔

ماہ شوال (جنوری ۱۹۳۸ء) میں "متاع کارواں" کے عنوان سے "ساربان" کا جو مضمون

شائع ہوا ہے اسکے صفحہ ۷۵ - ۲۷۴ پر سند رلال جی الا آبادی کا ایک خط نقل کیا گیا ہے جو انہوں نے ستمبر ۱۹۳۵ء میں مہاتما گاندھی کے نام لکھا تھا۔ یہ خط اکتوبر ۱۹۳۵ء کے ”جامعہ“ میں شائع ہوا اور اسکے بعد اردو کے مسئلہ سے دلچسپی رکھنے والے متعدد اخبارات و رسائل میں گشت کرتا رہا۔ اس میں من جملہ اور باتوں کے ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ ”مولانا سید سلیمان ندوی جیسے روشن جہنوں نے اپنی یوم النہی کی چھٹی ہوئی تقریر میں بجائے حضرت محمدؐ کے سوا ہی محمدؐ لکھا ہے“ مولانا کا ارشاد ہے کہ یہ محض بہتان ہے، انہوں نے کبھی ایسا نہیں لکھا۔

میں اس پر نادوم ہوں کہ میں نے تحقیق کیے بغیر اسکی اشاعت کو جائز رکھا۔ یہ فرود گدائست صرف اس وجہ سے ہوئی کہ مولانا نے اسوقت تک اس الزام کی تردید نہیں فرمائی تھی، اور انحالیکہ سند رلال صاحب کا یہ خط سال ڈیڑھ سال کی طویل مدت میں اس کثرت سے شائع ہو چکا تھا کہ مولانا اور دارالمصنفین کے تمام ارکان کا اس سے بے خبر رہنا متصور نہ تھا۔ تاہم عذر گناہ کا میں قائل نہیں، اپنی غلطی تسلیم کر کے مولانا سے معذرت خواہ ہوں۔

دارالاسلام پھنچنے کے بعد پہلا کام جو کیا گیا وہ یہ تھا کہ یہاں کی مسجد کو اس علاقہ کیلئے مسجد جامع قرار دیکر پانچ پانچ میل تک دیہات میں اعلان کرادیا گیا کہ آئندہ سے وہ جمعہ کی نماز پڑھنے کیلئے یہاں آیا کریں۔ خطیب کے فرائض میں نے خود اپنے ذمہ لیے، اور نہایت سہل زبان میں، جس کو ایک ان پڑھ دیہاتی بھی سمجھ سکے، خطبات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ الحمد للہ کہ اس کا اثر خاطر خواہ رونما ہوا۔ پہلے جمعہ میں قریب قریب ۵۰ آدمی تھے۔ دوسرے میں ۶۰ آئے، اور تیسرے میں ۱۵۳ تک تعداد پہنچ گئی۔ اردو کے خطبہ سے لوگوں میں اتنی دلچسپی پیدا ہو گئی ہے کہ ۵ میل کی حد سے باہر کے لوگ بھی خطبہ سننے کیلئے آجاتے ہیں۔ اس سے زیادہ یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ دیہات